

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اشارات

روس کے سابق ڈکٹیٹر سٹالن کی عاصمہ زادی سوئیڈن نے اپنے آبائی وطن روس اور اپنے بچوں کو خیر باد کہتے ہوئے اخبارات میں بعض ایسے خیالات کا اظہار کیا ہے جو واقعیت اور دوسوزی کا مرقع ہیں۔ ممکن ہے کہ بعض لوگ انہیں محض پروپیگنڈا کہہ کر نظر انداز کر دیں۔ لیکن ان خیالات کی نوعیت دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی آن ہونے احساسات نہیں بلکہ انسان کے فطری جذبات ہیں۔ سوئیڈن نے اخبار نویسوں کو ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ میرے ترک وطن کا سب سے اہم سبب مذہب ہے۔ میں نے ایک ایسے ملحد اور خدا ناس گھرانے میں آنکھیں کھولیں اور پرورش پائی جہاں خدا کا کبھی بھولنے سے بھی نام نہ لیا جاتا تھا۔ لیکن جب میں سن شعور کو پہنچی تو مجھے خود بخود بغیر کسی خارجی تحریک یا ترغیب کے یہ احساس ہونے لگا کہ خدائے لم نزل پر ایمان لاتے بغیر نہ تو زندگی، زندگی کہلانے کی مستحق ہے اور نہ انسان اور انسان کے مابین عدل و انصاف کا قیام ممکن ہے۔ میں مذہب کو انسان کے لیے آٹا ہی اہم اور ضروری سمجھتی ہوں۔ تنہا کہ ہوا اور پانی۔

اس نے کہا کہ انسانوں کو باہم ایک دوسرے سے الجھنے اور ایک دوسرے کا خون بہانے کے بجائے مل جل کر نسل انسانی کی فلاح و بہبود کے لیے تنگ و دو کرنی چاہیے۔ اس معاملے میں اساتذہ، سائنس دانوں، علمائے مذہب، اطباء اور قانون دانوں کے درمیان مملکت کی تنگ حدود سے نکل کر یا سیاسی تعصبات سے آزاد ہو کر اثراک عمل ہونا چاہیے۔

لہ یہ اردو سٹی خالی نہ ہوگا کہ سوئیڈن کا لفظی ترجمہ نوری جہاں ہے۔ شاید اس میں کوئی لفظ نوری جہاں نام پسند آیا اور اسے اسی کا ترجمہ کر کے زنی پٹی کا نام رکھ دیا۔

میرے نزدیک سرمایہ داروں یا اشتراکیوں کے مابین ہر قسم کی مصنوعی تفریق غلط ہے۔ انسانوں کے دو ہی درجے ہیں۔ نیک اور بھلے انسان، یا بُرے اور شریر انسان۔ دیانت دار اور مخلص انسان، یا بد دیانت اور دھوکے باز انسان۔ شریف اور مخلص لوگ جس ملک سے بھی تعلق رکھتے ہوں ان کے اخلاق اور مزاج میں بہت حد تک ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور ان کے عزائم اور ارادے بھی قریب قریب ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ ... میری حکومت مجھے مملکت یا ریاست کی ملکیت سمجھتے ہوئے میرے نکاح کے معاملے میں خارج رہی۔ مجھے اور میرے خاوند کو اٹھے سفر کرنے کی بھی اجازت نہ دی گئی۔ اس کی وفات کے بعد میرے برسوں کے بدلے ہوئے جذبات میں تلاطم پیدا ہوا اور وہ ابھر کر آپ سب کے سامنے آگئے ہیں۔

سو تیلانے خدا، مذہب اور ضمیر کی آزادی کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ کوئی ایسی باتیں نہیں جو پہلی مرتبہ دنیا کے سامنے آئی ہوں۔ یہ خیالات انسانی فطرت کے بنیادی حقائق ہیں جن سے انسان بحیثیت انسان آج تک کبھی صرف نظر نہیں کر سکا۔ حیات انسانی میں ان حقائق سے زیادہ کوئی چیز وزن دار اور مستم نہیں۔ انسان ان حقائق کو اپنے قریب ترین رشتوں سے زیادہ پہچانتا ہے۔ اُس کی فطرت قدم قدم پر ان کے صحیح اور برحق ہونے پر گواہی دیتی ہے۔ اس کا دل انہیں ماننے اور تسلیم کرنے میں سکون و اطمینان اور ان کے انکار میں اضطراب محسوس کرتا ہے۔ اس کا دماغ ان کے وجود سے کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی خالی نہیں ہوتا۔

آپ سب سے پہلے ہستی باری تعالیٰ کو ہی سمجھیے۔ ایک ایسی طاقتور، ہمہ گیر صاحب ارادہ اور عظیم و خیر ہستی جس نے اس کائنات کو ایک خاص نظم کے ساتھ پیدا کیا اور پھر اسے ایک خاص تدبیر کے ساتھ چلانے کا انتظام فرمایا، اس پر ایمان اور اعتقاد انسان کی فطرت میں داخل ہے جس شخص نے کبھی خدا کا نام تک نہ سنا ہو، اُس کے

دل میں بھی

دیکھے بھلے بن سوچے

جانے پھانے، بن بوچھے

وجود کا احساس ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ اس احساس کے مظاہر مختلف ہو سکتے ہیں۔ کبھی یہ کسی شخص کے اندر ایک ہلکی سی لے کی طرح ارتعاش پیدا کرتا ہے۔ کبھی یہ زلزلہ اور طوفان بن کر انسان کی پوری زندگی کو زیر و زبر کر دیتا ہے۔ کبھی یہ کسی شخص کے دل میں اس خاموشی کے ساتھ رہتا ہے کہ اسے اس کی گہرائی یا سطحیت کا شعور تک نہیں ہوتا، لیکن اس کا وجود ہر حال میں موجود ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے بڑی حیرت و استعجاب کے انداز میں فرمایا ہے:

أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَأَطِرِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ (ابراہیم: ۱۰)

کیا تمہیں اُس اللہ کی ہستی میں شک ہے جو تمام آسمان و زمین اور اُن کی ساری کائنات کی بنانے والی ہے؟ یعنی ایسی معروف ذات جو انسان کی شاہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہے اُس کے بارے میں آخر کس طرح شک کیا جا سکتا ہے؟ خدا کا وجود کوئی متنازع فیہ مسئلہ ہی نہیں ہے بلکہ زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ اس لیے کوئی شخص ہوش و حواس رکھتے ہوئے اسے ماننے میں کوئی تردد محسوس نہیں کر سکتا۔

مَنْ عَدَّ نَفْسَهُ فَقَدْ عَدَّ رَبَّهُ اَيْكٌ مشہور منقولہ ہے۔ انسان کا وجود، اس کی فکری

و ذہنی صلاحیتیں، اُس کے فطری داعیات، سب باری تعالیٰ کے وجود پر دلالت کرتے ہیں۔

انسان جب اپنے جسم پر غور کرتا ہے تو وہ اُسے صنعت و کاریگری کا نہایت عجیب و غریب نمونہ پاتا ہے۔ اپنے آپ سے ہٹ کر وہ جب کائنات پر ایک نگاہ ڈالتا ہے تو وہ یہ دیکھتا ہے

کہ یہاں ریت کے معمولی ذروں یا پانی کی چند بوندوں سے لے کر سرفیض پہاڑوں اور ظالم خیر سمند تک سب ایک زبردست اور قادر مطلق صانع کے وجود کی شہادت دے رہے ہیں۔ اسی حقیقت کی

طرت قرآن مجید نے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے:

دَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِلْمُؤْمِنِينَ وَفِي السَّمَاءِ آيَاتٌ لِلْمُؤْمِنِينَ وَاللَّيْلِ آيَاتٌ لِلْمُؤْمِنِينَ وَالنَّهَارِ آيَاتٌ لِلْمُؤْمِنِينَ - (ذاریت - ۲۰-۲۱)

”اور یقین کرنے والوں کے لیے زمین میں، اور خود تمہارے وجود میں بہت سی نشانیاں ہیں۔“

پھر کیا تمہیں دکھائی نہیں دیتا؟“

حقیقت یہ ہے کہ فطرت کے رنگارنگ مظاہر نے انسان کے اندر ایمانی کیفیت پیدا کرنے میں ہمیشہ

نہایت ہی اہم کردار ادا کیا ہے۔ انسان نے ہمیشہ فطرت کے جمال میں حسنِ ازل کی جھلک دیکھی ہے۔

پہاڑوں اور جنگلوں کی خاموش گویائی نے پکار پکار کر اُسے ایک آن دیکھی ذات پر ایمان لانے کی

دعوت دی ہے۔ سورج کی خشکیوں میں چاند کی ٹھنڈک میں، صبح کی صباحت اور شام کی

ملاحت میں اُس نے آیاتِ الہی کا مشاہدہ کیا ہے۔

بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ مناظرِ قدرت ہمیشہ اچھے احساسات ہی پیدا نہیں کرتے

بلکہ خوف کے جذبات کو بھی جنم دیتے ہیں۔ یہ بات بالکل صحیح اور درست ہے۔ لیکن اگر غور سے

دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایمانِ ایجابی اور سلبی دونوں کیفیات کا نام ہے۔ وہ اگر ایک طرف

انسان کے دل میں باری تعالیٰ کی بے پایاں رحمتوں کا احساس پیدا کرتا ہے تو دوسری طرف اُس

کے اندر شر اور بدی کے خیالات کو دبانے اور برائی سے باز رکھنے کے لیے اُسے عقوبتِ الہی سے

بھی ڈراتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان اپنے اندر قدرت کے حسین و جمیل مناظر سے رحمتِ خداوندی

کا احساس کرتا ہے اور اپنے دل کی دنیا کو رجائیت سے معمور کرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ قدرت

کے سینیناک مظاہر کو دیکھ کر اس کے دل میں خوفِ الہی بھی طاری ہو جاتا ہے۔

اس موقع پر میں اس فلسفیانہ بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کہ سلبی اخلاق یعنی وہ نیکی جو صرف سزاؤ

عذاب کے خوف سے کی جائے اور وہ اطاعت جس کا محرک ڈر ہو وہ کس حد تک معیاری نیکی کہلانے

کی مستحق ہے۔ لیکن بطور جملہ مقررہ آنا۔ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ محبتِ الہی اور خشیتِ الہی

دونوں ایمانی کیفیات پیدا کرنے کے لیے یکساں ضروری ہیں۔

مظاہر قدرت سے خالق کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔ مگر جب ہم اس کائنات پر غور و فکر کرتے ہوئے یہ دیکھتے ہیں کہ اس کائنات کے مختلف شعبوں اور گوشوں کے درمیان ایک معنوی ربط اور مقصدی ترتیب پائی جاتی ہے تو ہمارے سامنے صفاتِ الہی جلوہ گر ہوتی ہیں۔ ہم خالق کی تخلیق میں حیرت انگیز توازن اور ہم آہنگی دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ کائنات اور اس کا سارا کارخانہ کسی اندھی بہری قوت کی کارفرمائی کا نتیجہ نہیں ہیں بلکہ کوئی صاحب تدبیر ہستی پوری حکمت و دانائی کے ساتھ اسے ایک خاص مقصد کے تحت چلا رہی ہے۔ اس کی تخلیق بھی حیرت انگیز ہے اور اس کی تدبیر بھی حیرت انگیز۔ انسان اسے دیکھ کر اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے کہ یہ کسی ایسی طاقتور، علیم وخبیر اور صاحب تدبیر ہستی کی کوشش ہے جس کے قبضہ قدرت سے کوئی معمولی سے معمولی چیز اور کوئی بڑی سے بڑی چیز باہر نہیں ہو سکتی۔

نفس کی پہچان سے معرفتِ الہی دو طرح سے حاصل ہوتی ہے۔ ایک تو انسان کے اپنی جسمانی ساخت پر غور کرنے سے۔ اور دوسرے اپنی قلبی کیفیات اور واردات کا جائزہ لینے سے جس طرح مظاہر قدرت خالق کے وجود کی شہادت دیتے ہیں بالکل اسی طرح انسان جو صالح کائنات کی کارگری کا نہایت اعلیٰ و ارفع نمونہ ہے، وہ اس کی بے مثال صناعتی کی عکاسی کرتا ہے۔ مگر ان خارجی مظاہر سے ہٹ کر جب ہم انسان کی داخلی کیفیات پر غور کرتے ہیں تو وہاں بھی ہمیں قدم قدم پر قادر مطلق کے وجود کی شہادت فراہم ہوتی ہے۔

انہی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری ہر شعوری کیفیت کے لیے ایک معروض کا ہونا ضروری ہے۔ اگر غصہ آئے گا تو کسی بات یا شخص پر۔ محبت کے جذبات ابھریں گے تو کسی ذات یا عقیدے اور نصب العین کے لیے۔ اگر خوشی اور مسرت کی لہریں اٹھیں گی تو کسی چیز یا خیال پر۔ اگر احترام

اور عقیدت پیدا ہوگی تو کسی شخص، گروہ یا نظریے کے لیے غرض ہر نفسی کیفیت کے لیے ایک معروض ہونا ناگزیر ہے۔ یہ معروضات ضروری نہیں کہ محسوس اشیاء ہی ہوں۔ یہ پیکر محسوس بھی ہو سکتے ہیں اور خیالات و تصورات بھی۔ بلکہ اکثر صورتوں میں دیکھا گیا ہے کہ خیالات و تصورات سے انسان کے دل کی دنیا جتنی زیر و زبر ہوتی ہے اتنی محسوسات سے نہیں ہوتی۔ غلطی کا احساس جتنی زیادہ مذامت پیدا کرتا ہے خود گناہ کا ارتکاب کرنے وقت اتنا شدید احساس پیدا نہیں ہوتا۔ دل شکن اور تلخ بات خود اتنی زیادہ ناگوار محسوس نہیں ہوتی جتنی کہ غلطی ویر بعد اس کی یاد۔ اب اگر بھوک کا احساس اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ کوئی چیز ایسی موجود ہے جس سے بھوک مٹائی جاسکتی ہے۔ یا محبت کا احساس اس بات کی شہادت فراہم کرتا ہے کہ کوئی ذات، عقیدہ یا نظریہ ایسا ہے جو اس کے جذبہ محبت کی تسکین کر سکتا ہے، تو آخر اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کونسی چیز مانع ہے کہ انسان کے اندر جب یہ فطری احساس پایا جاتا ہے کہ اس عالم مجاز و محسوسات سے بالاتر، ہمارے نظام کائنات سے ارفع و اعلیٰ ایک آن دیکھا نظام موجود ہے، تو اس کی تڑپیں بھی کچھ اُن دیکھے حقائق کا وجود ناگزیر ہے۔ جب ہم ہر شعوری کیفیت کے لیے ایک معروض کے وجود کو ضروری سمجھتے ہیں تو آخر مذہبی احساس کے لیے کسی معروض کو کیوں ضروری نہیں سمجھتے! اس معروض کا وجود دوسرے تمام معروضات سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حتیٰ کیفیات ہر وقت پیدا نہیں ہوتیں۔ مثلاً ہمیں بھوک مٹانے اور پیاس بجھانے والی اشیاء کا خیال اُس وقت آتا ہے جب ہمیں اس کے لیے تحریک ہو۔ مگر مذہبی احساس سے ہم ایک لمحہ کے لیے بھی یہ نیاز نہیں رہ سکتے کیونکہ ہم کوئی خیال دل میں لاتے ہوئے یا کوئی عمل کرتے ہوئے یہ بات سوچنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں کہ یہ خیال یا فعل عالم محسوسات سے ماوراء اُن دیکھے نظام سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں۔

جس طرح ہمارے حسی داعیات آدمی اشیاء کے حصول سے تسکین پاتے ہیں بالکل اسی طرح ہمارا حاتمہ مذہبی، جو ان داعیات سے کہیں زیادہ انسانی فطرت کا لازمی عنصر ہے، کسی ذات میں الوہیت

کی شان دیکھ کر اطمینان پاتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جس ہستی میں وہ الوہیت کی شان دیکھتا ہے وہ فی الحقیقت اس کی اہل بھی ہو۔ وہ بسا اوقات اپنی حماقت یا بے بصری سے اُس کو اُن ہستیوں یا محسوس اور غیر محسوس پیکروں میں تلاش کرتا ہے جو اس سے کسی حالت میں بھی مشرف نہیں ہو سکتے۔ مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ الوہیت کی شان دیکھے بغیر اور اس کے ساتھ رشتہ عبودیت قائم کیے بغیر زندگی کا خلا پر نہیں ہوتا۔ انسان کو اپنا نظام تنفس قائم رکھنے اور اپنی تباہی کے لیے پاکیزہ ہوا کی ضرورت رہتی ہے لیکن اگر پاکیزہ ہوا میسر نہ ہو تو وہ خلا میں زندہ نہیں رہ سکتا بلکہ اس ضرورت کو وہ کشیف ہوا ہی سے پورا کر کے سانس کے رشتہ کو ہر حال میں قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح اگر ایک فرد اُس قادرِ مطلق خدا کی معرفت تک نہیں پہنچتا جس کی ذات الوہیت کا بلا شکر غیر استحقاق رکھتی ہے تو اس کا مذہبی احساس اپنی تسکین کے لیے کچھ جھوٹے الٰہ بنا کر اُن کی بندگی اختیار کر کے اپنے اس مذہبی اور روحانی خلا کو پُر کرتا ہے۔

جس طرح سانس اور زندگی کو ایک دوسرے سے الگ کرنا ناممکن ہے بالکل اسی طرح انسان کو جس بندگی سے جُدا نہیں رکھا جاسکتا۔ یہ بات انسان کی سرشت میں داخل ہے کہ وہ کسی الٰہ کے ساتھ رشتہ عبودیت استوار کرے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان نے مختلف اوقات میں مختلف ہستیوں یا مختلف اشیاء کو الٰہ بنا یا لیکن اُس نے اپنے حاتمہ مذہبی کی تسکین کے لیے کبھی بھی ان ہستیوں یا چیزوں کی طرف اُن کی اصل کے اعتبار سے رجوع نہیں کیا۔ اس کی رُوح ان کے اندر الوہیت تلاش کر کے اطمینان کا سامان فراہم کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ انسان کبھی درختوں اور پتھروں کے سامنے سربسجود ہوا کبھی پہاڑوں، دریاؤں اور سمندروں کے سامنے جبینِ نیاز جھکائی، اور دورِ جدید میں ملک، قوم، وطن، معاشرے اور ریاست کو خدا بنا کر اُس کی پرستش شروع کی۔ لیکن ان جھوٹے خداؤں کے پرستاروں کی اگر ذہنی کیفیت کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ان میں سے کسی ہستی، چیز یا ادارے کو بجا ہے خود اللہ تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوتے بلکہ انہیں مظاہر الوہیت سمجھ کر ان کی بندگی اختیار کرتے ہیں۔

مذہب اور فلسفہ مذہب کے مغربی ماہرین کو اس باب میں سخت غلطیاں لاحق ہوئی ہیں اور انہوں نے حاسہ مذہبی کی صحیح نوعیت کو نہ سمجھنے کی وجہ سے عجیب و غریب ٹھوکریں کھائی ہیں۔ انہوں نے غلطی سے یہ سمجھ لیا ہے کہ یہ حاسہ مذہبی کوئی الگ احساس نہیں بلکہ انسان کے حسی داعیات کا ہی حصہ ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے موقف کی حمایت میں یہ دلیل دی کہ انسان جب اشیاء یا شخصیتوں سے مستفید ہونے کی توقع رکھتا یا ان سے خوف محسوس کرتا ہے تو انہیں خدا بنا لیتا ہے۔ فائدے کی توقع اور نقصان کے اندیشے سے کبھی کسی چیز یا ذات میں شان الوہیت پیدا نہیں ہوتی۔ اس سے انسان کے اندر مفید اشیاء کے حصول کی خواہش اور مضرت رساں اشیاء سے بچنے کی تمنا پیدا ہوتی ہے۔ الوہیت اس سے بالکل مختلف چیز ہے۔ یہ ایک ایسی صفت ہے جس سے انسان کے حاسہ مذہبی کی تسکین ہوتی ہے اور جس ذات میں وہ اسے جلوہ گر پاتا ہے اُس کے سامنے سرعجز و نیاز جھکا کر اپنی روح کو پوری کائنات اور اس کے خالق کے ساتھ ہم آہنگ محسوس کرتے ہوئے اسے تسکین پہنچاتا ہے۔ چنانچہ دیکھئے کہ خود ان مذاہب میں بھی جو "پیکر محسوس" کی پرستش کرتے ہیں یہ پیکر محض ضمنی اور ثانوی حیثیت رکھتے ہیں اور انسان ان کی مدد سے الوہیت کے اُس منبع تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے جہاں سے اُس کی روحانی پیاس بجھ سکتی ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ وہ اپنی توجہ صرف ان پیکران محسوس تک ہی محدود نہیں رکھتا بلکہ ان سے گزر کر فوراً صفات الہی کے تصورات تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پیکر محسوس وہ ایمانی کیفیت پیدا نہیں کر سکتا جس کا انسان کی فطرت تقاضا کرتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ خود یہ ایمانی کیفیت کیا ہے جس کے تحت انسان ان دیکھی حقیقت کو محسوس و مشہود حقیقت سے زیادہ یقین کے ساتھ مانا اور اُس سے زیادہ شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایمانی کیفیت و حقیقت ایک ایسا مثبت فطری جذبہ ہے جس کے زیر اثر محدود و لامحدود کی معرفت حاصل کر کے، اس کی تصدیق کرتا ہے اور پھر اپنی زندگی کو اُس کے فشا اور مرضی کے مطابق ڈھلنے کے لیے کوشاں ہوتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اہل ایمان کو صدیق

کہا گیا ہے :

وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ
أُولَٰئِكَ هُمُ الصِّدِّيقُونَ - (الحجید - ۱۹) وہی صدیقی ہیں۔
اور جو لوگ خدا اور اس کے انبیاء پر ایمان لائے

پھر قرآن مجید نے ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ ایمان ایک ایسی قلبی کیفیت کا نام ہے جس سے انسان
کہ یقین کے ساتھ طمانیت کی دولت بھی حاصل ہو، کیونکہ انسان کا یقین اُس وقت تک پختہ نہیں ہوتا
جب تک اُس کا دل کسی حقیقت پر مطمئن نہ ہو جاتے۔

معاہدہ پیرا نہیں دو جذبات پر ختم نہیں ہوتا بلکہ جب انسان کے دل میں یقین پوری طرح راسخ ہو
جاتا ہے اور انسان کو اپنے عقیدے پر پوری طمانیت حاصل ہو جاتی ہے تو پھر وہ بندگی کے دوسرے
لوازم پورے کرتا ہے۔ انسان کسی ذات یا ادارے کو اس وقت تک اللہ بنا کر اپنے حاسنہ مذہبی کی
نسکین نہیں کر سکتا جب تک وہ الوہیت کے سارے تقاضے پورے نہ کرے۔ اور اسے انسان کی خوش
بخئی کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ سوائے ذات باری تعالیٰ کے کوئی دوسری ہستی ایسی نہیں جو
اس اعتبار سے انسان کو مکمل سکون اور اطمینان جہتا کر سکے۔ خالق کائنات کے سوا انسان جتنے جھوٹے
اللہ بنا کر ان کی پرستش کرے گا اتنا ہی وہ مذہب اور روحانیت کے شیریں عنصر سے محروم رہے گا۔

لفظ اللہ کے مختلف مشتقات کا جو ذکر ائمہ لغت نے کیا ہے انہیں دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ
اُس ذات برحق کے سوا کوئی دوسری ذات اس کی سزاوار نہیں ہو سکتی۔ انسان اگر کسی غلط فہمی میں مبتلا
ہو کر دوسروں کو بطور الہامان بھی لے لے تو اُس کی رُوح کبھی مطمئن نہیں ہو سکتی اور وہ اسی طرح اضطراب
محسوس کرتی ہے جس طرح کہ سوتیلانے انستراکتیت کی خدائی کے اندر رہتے ہوئے محسوس کیا۔ ہم یہاں
بطور مثال لفظ اللہ کے چند مشتقات نقل کرتے ہیں۔

بعض ائمہ نحو کا خیال ہے کہ یہ لفظ اللہ بمعنی نخبیر سے مشتق ہے۔ باری تعالیٰ کی ذات اور اس
کی صفات کے ادراک سے چونکہ عقل عاجز ہے اس لیے اُسے اللہ کہا گیا ہے۔ یہ انسان کی اللہ تعالیٰ

کے معاملے میں اسی بے بسی اور درماندگی کا نتیجہ ہے کہ اس کے اندر احساس اور فروتنی پیدا ہوتی ہے اور اُس کا دل رشد و ہدایت کے اُس نظام کی تلاش کرتا ہے جس کا منبع و مصدر محدود عقل کے خام تجربات نہیں بلکہ وہ سلسلہ وحی و الہام ہے جو ہر خطا سے پاک اور منترہ ہونے کی بنا پر ہر لحاظ سے قابل اعتماد ہے۔

بعض دوسرے ائمہ نے یہ کہا ہے کہ لفظ اللہ اصل میں ولاء ہے۔ واؤ کو ہمزہ سے بدل کر الاء لیا گیا اور اس طرح ولاء کے معنی ہوتے عشق و محبت میں دارفتہ اور پیچہ۔ چونکہ ذات باری تعالیٰ سے مخلوق کو وابہانہ محبت و عقیدت ہوتی ہے اس لیے اُسے اللہ کہہ دیا۔ ایمانی کیفیت کے لیے معبود سے بے انتہا محبت — ایک ایسی محبت جو دوسرے سارے علائق اور رشتوں پر غالب ہو — بنیادی شرط ہے۔ کسی ذات کی الوہیت تسلیم کرنے کے معنی ہی یہی ہیں کہ آدمی اُس ذات کی خوشنودی کے لیے جیسے اور اُسی کے منشا کو پورا کرنے کے لیے مرے۔ اُس ذات سے زیادہ اُسے کوئی ہستی یا چیز عزیز تر نہ ہو۔

الوہیت کی صحیح طور پر مستحق وہی ذات ہو سکتی ہے جو زمان و مکان کی حدودوں سے آزاد اور عالم محسوسات سے ماورا ہو۔ کیونکہ محسوس اشیا کبھی بھی استغراق اور دھیان کا موضوع نہیں بن سکتیں جو ذات غیب اور مستور ہو اس کے ساتھ روحانی تعلق پیدا کر کے ہی انسان مذہبی احساس کی تسکین حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ جن لوگوں نے بھی پیکر محسوس کو الوہیت کا مظہر سمجھا انہوں نے بھی اُس ذات میں روحانی اور مذہبی استغراق پیدا کرنے کے لیے اپنی زیادہ تر تجربہ صفات الوہیت یا الوہیت کے مجرد تصورات پر مرکوز رکھی۔ کیونکہ ان کے بغیر استغراق کی کیفیت کا پیدا ہونا بالکل ناممکن ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سطح بین آنکھیں بسا اوقات لباس مجاز میں الجھ کر رہ جاتی ہیں، مگر انسان کی فطرت نے ہمیشہ اس کیفیت پر اضطراب محسوس کیا ہے اور اس کے دل بیتاب نے پس پردہ جھانکے اُس حقیقت کبریٰ کا کھوج لگانے کی کوشش کی ہے جو اس لباس مجاز میں جلوہ گر ہے۔

اہل مغرب اور خصوصاً انٹراکٹیت کے علمبرداروں کو ماورائے حسی حقائق کے ابطال پر بڑا ناز ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جن اشیا یا اداروں کو انہوں نے اپنا اللہ بنایا ہے انہیں وہ مستور اور

غیب ہی سمجھتے ہیں اور ان کے بارے میں یہ پختہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ محسوسات سے بالا ہیں ہم یہاں بطور مثال مملکت کو دیکھتے ہیں مملکت جو انسانی آبادی اور جغرافیائی حدود کا مجموعہ ہے وہ الوہیت کی منظر ہے مگر وہ اللہ نہیں۔ اللہ ان کے نزدیک ریاست ہے اور یہ محض ایک ایسی قوتِ قاہرہ کا تصور ہے جو ہر عیب سے پاک اور ہر کمزوری سے مبرا ہے اور جس کا ارادہ سب پر حاوی اور جس کی اطاعت سب لوگوں پر فرض ہے۔ جو عوام سے بلا شرکتِ غیرے فرمانبرداری کا مطالبہ کرنے کا حق رکھتی ہے۔ ماورائے محسوسات سے انکار کرنے والا مغربی ذہن ریاست کو صرف ایک تصور ہی سمجھتا ہے اس کی وجہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اللہ جب تک مستور نہ ہو اس وقت تک اس کے ساتھ وہ روحانی تعلق پیدا نہیں ہو سکتا جو مذہب کا لازمی اور ضروری جزو ہے۔ چنانچہ لفظ اللہ کے سلسلے میں بعض اہل علم کا خیال یہ ہے کہ یہ لفظ لَاَ اَبْصَارًا وَّ هُوَ يُبْصَرُ لِيَا هَلْكَ سَمْتُكَ ہے اور اس کے معنی ہی ہیں پردہ میں چھپ جانا۔ چونکہ باری تعالیٰ بھی نگاہوں سے مستور و معجوب ہے اس لیے اسے اللہ کہا جاتا ہے۔ اسی معنی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے ارشاد فرمایا ہے :

لَا تَأْتِيهِ الْبُصُورُ وَ هُوَ يُبْصَرُ
الْأَبْصَارَ - (الانعام - ۱۳)

نگاہیں اس کا ادراک نہیں کر سکتیں اور وہ نگاہوں کا ادراک کر سکتا ہے۔

یعنی الوہیت کی حامل وہی ذات ہوتی ہے جو انسان کی نگاہ سے مستور ہو مگر انسان بہ ضرورت یقین رکھتا ہو کہ وہ ذات اُسے اچھی طرح دیکھ رہی ہے اور اُس سے اُس کی کوئی بات مخفی نہیں ہے۔ اُس ذات کے غیر محسوس ہونے کی بنا پر ہی انسان کے اندر اُس کے بارے میں وہ لطیف احساسات ابھرتے ہیں جن سے وہ اپنی روحانی پیاس بجھاتا ہے۔

ان وجوہ کی بنا پر اس حقیقت کا سمجھنا کچھ مشکل نہیں کہ خدا اور مذہب کے بارے میں سوتیلانا کے احساسات کوئی غیر فطری جذبات نہیں بلکہ اس نے جو کچھ کہا ہے وہ انسانی فطرت کا عین اقتضا ہے۔ انسان کا حاشیہ مذہبی اپنی تسکین کے لیے کسی نہ کسی اللہ کی پرستش کے لیے اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے اور

برکے کے الفاظ میں اگر وہ ذات باری کو اپنے دل میں بحیثیت معبود جگہ نہیں دیتا تو پھر شیطان کو وہاں بسا کر اُس کی پوجا کرتا ہے۔ مذہب کو اختیار کیے بغیر کوئی چارہ نہیں اور کسی اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کیے بغیر انسان رہ نہیں سکتا۔ اب یہ انسان کی خوش نصیبی یا اُس کی بدبختی ہے کہ وہ خالص حقیقی کی بندگی اختیار کر کے دنیا اور آخرت میں فلاح و کامرانی حاصل کرتا ہے یا باطل خداؤں کا پرستار بن کر دنیا اور عقبی دونوں جگہ نامراد بنتا ہے۔

خدائے لم یزل پر ایمان نہ صرف انسانی فطرت کا لازمی جزو ہے بلکہ سوتیلانہ کے الفاظ میں اُس پر ایمان لائے بغیر نہ تو زندگی صحیح معنوں میں زندگی کہلانے کی مستحق ہو سکتی ہے اور نہ انسان اور انسان کے مابین عدل و انصاف کا قیام ممکن ہے۔ اصل میں خدائے واحد پر ایمان ہی سے انسان کے اندر یہ احساس ابھرتا ہے کہ اپنی زندگی میں منشاء الہی سے مطابقت پیدا کرے۔ یہی احساس اُسے مادی نفع و نقصان کے خم و پیچ سے آزاد کر کے کسی اعلیٰ اور ارفع نصب العین سے لذت آشنا کرتا ہے۔ اگر انسانی عمل کے محرکات صرف مادی ہوں تو زندگی بالکل بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے کیونکہ اس طرح انسان مسکاپی طور پر مادی فوائد کے حصول کے لیے سرگرداں رہتا ہے اور اخلاقی نقطہ نظر سے بھلے اور بُرے کے درمیان تمیز نہیں کر سکتا۔ اُس کے نزدیک بُرائی وہ ہوتی ہے جس سے مادی نقصان کا اندیشہ ہو اور اچائی وہ جس سے مادی منافع حاصل ہوں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ طرز فکر انسان کو اعلیٰ مرتبہ و مقام کی طرف لے جانے کے بجائے اُسے حیوانوں کی پست سطح پر لے جاتے گا اور وہ روحانی اور اخلاقی اعتبار سے بلند ہونے کے بجائے رستی خواہشات کا غلام بننے میں لذت محسوس کرے گا۔ چنانچہ دیکھیے کہ جب تک انسان نے مذہبی اخلاق کو نظر انداز کر کے افادی اخلاق کو اپنا ما شروع کیا ہے اُس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں زبردست بگاڑ پیدا ہوا ہے۔ حال میں دنیا کے سب سے زیادہ خوشحال معاشرے کا جائزہ لینے سے یہ معلوم ہوا ہے کہ ۱۹۶۵ء میں امریکہ کے انڈر پولیس کے نوٹس میں صرف چوری اور سرتقہ کی ۲۵ لاکھ وارداتیں لائی گئیں۔ اس نشرِ شیناک صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے تحقیق جرائم کے کمیشن نے جھنجھلاہٹ

کے عالم میں کہا کہ ان جرائم کے قلع قمع کے لیے مندرجہ ذیل صورتیں ہی ممکن ہو سکتی ہیں:

(۱) تمام بڑے بڑے شہروں کو جن کی آبادیوں کا چھٹا حصہ قانون اور تیسرا حصہ ڈاکوؤں پر مشتمل ہے، ہمارا کر دیا جائے۔

(ب) ۱۵ اور ۱۹ سال کی عمر کے بچوں کو عام معاشرے سے الگ رکھنے کا انتظام کیا جائے کیونکہ یہی گروہ سب سے زیادہ قانون شکنی کرتا ہے۔

(ج) تمام بزنس رتن سواروں کا خاتمہ کر دیا جائے کیونکہ ایک تو یہ ۵ لاکھ کی تعداد میں ہر سال چوری کر لی جاتی ہیں۔ دوسرے بنکوں کو لوٹنے، ہنگامگ اور اسی نوعیت کے دوسرے جرائم کے لیے ان سے مدد ملتی ہے۔

(د) تمام بڑے بڑے کاروبار سمیٹ لینے چاہئیں، کیونکہ دولت کے ہوس کاروں کو یہ ناجائز کمائی کے لیے ترغیب دیتے ہیں۔

اس المناک صورت حال کی وجہ غربت اور افلاس نہیں بلکہ اُس داخلی نظم و ضبط کا فقدان ہے جو مذہب انسان کے اندر پیدا کرتا ہے۔ قانون کا ہاتھ تو چند جرائم کے صرف خارجی واقعات کی گرفت کر سکتا ہے مگر دل کی انجان گہرائیوں میں ابھرنے والے معصیت آلود خیالات تو صرف اُس چشم ہمہ بین پر ایمان ہی سے دب سکتے ہیں جس کے متعلق آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ خواہ دنیاوی مولفہ سے وہ کتنا محفوظ ہو مگر اُس زبردست ہاتھ سے وہ محفوظ نہیں رہ سکتا۔ انسان کو راہ ہدایت پر قائم رکھنے کے لیے صرف فوجداری اور دیوانی قوانین ہی کافی نہیں ہیں، بلکہ کمیشن کے الفاظ میں اگر اس کے دائرے کو حکومت مسلسل پھیلانی چلی جائے تو انسان کے لیے زندگی ناممکن ہو جائے۔ مگر روز بروز وسیع تر دائرے پر پھیلانے کے باوجود یہ قوانین ان کی روک تھام میں کیسے ناکام رہے کیونکہ ان جرائم کی نوعیتیں اور ان کی علتیں اتنی پیچیدہ اور الجھی ہوئی ہوتی ہیں کہ ان کی کثیر تعداد کے معاملے میں قانون بے بس ہوتا ہے۔ ان قوانین سے زیادہ سے زیادہ وہ اخلاق پیدا ہو سکتا ہے جسے اگر نری میں اُجالے کا اخلاق (DAY LIGHT MORALITY) کہتے ہیں۔ یعنی اگر کوئی دیکھتا نہ ہو، اگر باخود

ہونے کا اندیشہ نہ ہو اور زمانہ نشیمن سے بچ نکلنے کا موقع ہو تو برائی کا ارتکاب کر لیا جائے ورنہ اس سے اجتناب کیا جاتے۔ باقی رہا وہ اخلاق جو انسان کو خود اپنے نفس کا عاسبہ کرنے کی ترغیب دے تو وہ صرف ایمان باللہ ہی سے پیدا ہو سکتا ہے یعنی ایک سمیع و بصیر، علیم و خیر مستی پر ایمان لانے سے جو ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے اور جس کی طرف انسان کو لوٹ کر جانا ہے اور اپنے ہر عمل کا حساب پیش کرنا ہے۔

سو نیلانے اپنے اس بیان میں ایک اور صحیح بات یہ بھی کہی ہے کہ انسان اور انسان کے وہیہ اگر کوئی انبیاء کیا جاسکتا ہے تو وہ نیکی اور بھلائی کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ انسان نے رنگ، نسل، زبان یا دولت کی بنیاد پر نوع انسانی کے درمیان جو تفریق پیدا کر رکھی ہے وہ سراسر غیر فطری اور باطل ہے انسان بحیثیت انسان احترام اور عزت کا مستحق ہے۔ وہ اگر نیکی اور بھلائی کی راہ پر گامزن ہے تو وہ واجب انعام ہے لیکن اگر وہ شر کا علم دار ہے اور خلق کو اُس کے وجود سے نقصان پہنچاتا ہے تو اسے کسی تو قیر کا سزاوار نہیں سمجھا جاسکتا۔ انسان نے انسان کی عزت و احترام کا جو مصنوعی اور خود ساختہ معیار قائم کر رکھا ہے وہ سراسر باطل ہے اور اس کا مقصد چند مفاد پرست طبقوں یا قوموں کے مادی مفادات کا تحفظ ہے۔

سو نیلانے روس کے اندر جس جبر و استبداد اور جس گھٹن کا ذکر کیا ہے یہ کوئی حیرت انگیز انکشافات نہیں۔ تھوڑی سی سمجھ بوجھ رکھنے والا انسان ان کی حقیقت، کو خود بخود سمجھ سکتا ہے۔ اشتراکی مصنفین نے سرمایہ دارانہ نظام پر گرفت کرتے ہوئے جس نکتہ پر اپنا سارا زور صرف کیا ہے وہ یہ ہے کہ ذرائع پیداوار استحصال کا ذریعہ ہیں اور جب یہ افراد کے قبضہ میں ہوں تو وہ ان کی مدد سے غریب عوام پر عرصہ حیات تنگ کر دیتے ہیں۔ ہیرٹز لاسکی نے اس موضوع پر بڑی تفصیلی بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ ایک طرف تو یہ سرمایہ دار افراد مزدوروں اور معاشروں کے کمزور

طباقوں کو دل کھول کر لٹھتے ہیں مگر دوسری طرف ان کے سیاسی دباؤ کی وجہ سے یہ کسی کو بھڑکھڑانے اور جدا
احتجاج بلند کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتے۔ ملک کا معاشی نظام ان کے مفادات کا محافظ ہوتا ہے بلکہ
کا آئین ان کی تائید اور حمایت کرتا ہے۔ الغرض پورا ملک، پوری آبادی اور اس کے وسائل صرف
ان سرمایہ دار طبقوں کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔

اس تجربہ میں بلاشبہ بہت کچھ صداقت پائی جاتی ہے۔ لیکن ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ جب چند سرمایہ
دار محدود وسائل رکھتے ہوئے کمزور اور بے بس انسانوں کو اپنے ظلم و ستم کا جس طرح چاہتے ہیں تختہ
مشق بنالینے ہیں تو آخر کیا وجہ ہے کہ پوری مملکت اور اس کے چند سربراہ سارے ملک کے وسائل
کو اپنے قبضہ میں لے لینے کے بعد استحصال سے دستکش ہو جائیں گے اور ان کے دل میں سوائے
عوام کی خیر اور بھلائی کے اور کوئی خیال جاگزیں نہ ہوگا؟ اگر سرمایہ ایک فرد کے لیے قوت کا ذریعہ
بن کر اُسے ظلم و ستم پر اُبھارتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ پورے ملک کے وسائل پیداوار حکمران گروہ کے
ہاتھ میں آکر اُسے جا برا اور مستفید نہ بنادیں اور وہ ہر قسم کے خوف سے یکسر لیے پروا ہو کر انسانوں
پر جس طرح چاہیں اپنی خدائی کا تسلط قائم نہ کریں۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ذرائع پیداوار پر حکومت کا قبضہ ہونے کی وجہ سے کسی کے کوئی ذاتی
مفادات نہ رہیں گے اور اس طرح کسی کے ذہن میں استحصال کا خیال نہ پیدا ہوگا۔ لیکن یہ محض فریب نظر
ہے۔ اصل میں انسان جس چیز کا طلبگار ہوتا ہے وہ قوت ہے اور چونکہ اُسے دولت کے ذریعے معاشرے
میں قوت حاصل ہوتی ہے اس لیے وہ اس کے حصول کے لیے ہر جائز و ناجائز کوشش کرتا ہے۔ دولت
تو قوت حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور پھر وہ اسی قوت کے بل بوتے پر عوام کی گردنوں پر مسلط
ہو کر انہیں اپنی اغراض کے لیے استعمال کرتا ہے۔ مفادات ہمیشہ دولت کی صورت ہی میں نہیں ہوتے
بلکہ قوت کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اشتراکی مملکت پر سارے عوام تو حکمران
نہ ہونگے بلکہ چند رہنما ہی ہونگے۔ ان رہنماؤں کا پورے ملک پر قبضہ ہوگا۔ ان حالات میں قوت کے
نشہ میں سرشار ہو کر یہ من مانی کارروائیاں بھی کریں گے۔ جب سرمایہ دار تھوڑی سی قوت حاصل ہو

(بقیہ اشارات)

جانے کے بعد ظلم کا پیکر بن جانا ہے تو اتنی عظیم قوت پر قابض ہو جانے کے بعد یہ آخری قسم کی خود غرضی سے کس طرح پاک رہیں گے؟ اور پھر وہ کونسی ایسی تنظیم یا ادارہ ہو گا جو انہیں غلط راستہ پر جانے سے روک سکے؟ یا ان کے غلط راستے پر چلے جانے کے بعد انہیں راہ راست پر لاسکے؟ یا انہیں ہٹا کر بہتر آدمی لاسکے؟